ایم اسلم

سر زمین پنجاب اپنی بوقلموں صفات کی بنا پر سدا سے ہندوستان کی ایک بیش قیمت دولت رہی ہے۔ اس کے شہروں کی زندگی گنگناتی رہتی ہے اور اس کے دیہاتوں کی آبادی ہنستی مسکراتی رہتی ہے۔ شیشم کے سائے میں محبت کے پودے پنپتے ہیں اور رومانی جھیلوں میں حسن و عشق کے کنول کھلتے ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں کے عشقیہ ناٹک اسی سر زمین کے اسٹیج پر کھیلے گئے اور اس دل سوزی کے ساتھ کہ رہتی دنیا تک ان کے نام زندہ رہیں گے۔ سچ ہے عشق میں جان دے کر انسان ز ہ جاوید ہو جاتا ہے۔

سرسید نے یہاں کے بسنے والوں کو ز دلان پنجاب کہا۔ اس خطے کا موسم اور ماحول ہی ایسا ہے کہ یہاں کے بسنے والوں میں جسم اور روح کی توانائی پیدا ہوتی ہے محنت اور جفاکشی کو جی چاہتا ہے۔ دل میں امنگ اور روح میں ترنگ پیدا ہوتی ہے اور زندگی ز ہ دلی کا مرقع بن جاتی ہے اور سچ پوچھو تو ؎

زندگی دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

یا یوں سمجھو کہ پنجاب کے لوگ جینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ زندگی کی مقدس امانت کو عیش و عشرت کے آستانے پر بھینٹ نہیں چڑھاتے۔ زندگی سے پورا پورا مصرف لیتے اور اپنے فرض کی تکمیل کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ زندگی کے اور حلقوں سے قطع نظر ایک ادب کے حلقے ہی کو لیجیے اور دیکھیے کہ اس بیسویں صدی میں کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں وجود میں آئیں۔ پنجاب کے لفظ کے ساتھ سب سے پہلا تصور پیغمبر خودی علامہ اقبال مرحوم کا وابستہ ہے۔ جن کی شہرت کا ڈ چار دانگ عالم میں بج چکا ہے۔ ان کے بعد سر عبدالقادر ہیں جنہیں جدید ادبی رسائل کا باوا آدم کہنا چاہیے۔ رنویسوں میں مولانا ظفر علی خاں کا اسم گرامی سرفہرست ہے اور مصنفوں میں میاں محمد اسلم (جو عرف عام میں ایم۔ اسلم کہلاتے ہیں) کا نام نامی سب سے زیادہ مرکز نظر بنا رہتا ہے۔

سر وقد، کھلتا رنگ، کتابی چہرہ، خنداں پیشانی، چمکدار آنکھیں، ان پر عینک پتلے پتلے لبوں پر

کتر واں مونچھیں جن میں ایک غمگین مسکراہٹ چھپی رہتی ہے۔ ٹھوڑی سے استقلال ٹپکتا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی، کوٹ اور شلوار کالر اور ٹائی، عمر ستر سے متجاوز، کاٹھی مضبوط، یہ ہے ایم اسلم کا ظاہری وضع، جیسا ان کا ظاہر اجلا ہے ویسا ہی ان کا باطن بھی ستھرا ہے۔ باتیں بڑی موثر اور دلکش کرتے ہیں۔ ان کے انداز گفتگو سے ان کی شرافت نسبی ٹپکتی ہے ان کی کوئی بات قرینے اور سلیقے سے خالی نہیں ہوتی۔ سادہ پرکاری جو اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی نجی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ بہت معمولی انداز میں کوئی بات کہیں گے مگر ہوگی گہری اور وزنی۔ دوستوں پر جان دیتے ہیں اور انہیں زیر بارمنت کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ دل کے صاف ہیں، کبھی کسی کو مشتبہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اپنی اس کمزوری کی بدولت اکثر نقصان اور تکلیف اٹھاتے ہیں اور بے مہری احباب کے شکوہ سنج رہتے ہیں مگر وسیع القلبی نے چشم پوشی اور درگزر کو ان کا شعار بنا دیا ہے۔

ہمیں ایسی کئی مثالیں معلوم ہیں کہ جن لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے جڑتی تھی آج اسلم صاحب کی امداد کی بدولت ہزاروں روپے رول رہے ہیں۔ میرا چشم د۔ واقعہ ہے کہ ۳۴ء میں ایک صاحب آئے جن کی ہیت کذائی پر مفلسی اور بدحالی کی چھاپ تھی۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ میرے ہم پیشہ ہیں۔ ان صاحب نے بیڑا اٹھایا تھا کہ طباعت کتب کا کاروبار نہایت ا۔ نداری سے کریں گے۔ چنانچہ اسلم صاحب سے چھپی چھپائی کتابوں کا اسٹاک لے گئے اور اس کے علاوہ تین کتابوں کے مسودے بھی۔ اس وقت میاں صاحب سے بہتر ادیب اور ایسا کریم النفس انسان ان صاحب کے ۔۔دیک دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کتابیں چھپیں اور خوب بکیں۔ کئی کئی ایڈیشن ہو گئے۔ چند سال بعد انہی ناشر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہیں پہچاننے میں تکلف ہوا۔ کلے پر کلہ چڑھا ہوا توند ان سے فٹ بھر آگے چلتی تھی۔ بے فکری اور فارغ البالی کی مہر ان پر لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کا کاروبار خوب چمک گیا ہے، کچھ زمین بھی خرید لی ہے۔ انہیں دیکھ کر بہت جی خوش ہوا مگر ان کی باتیں سن کر بڑی حیرت اور نفرت ہوئی۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے ان کے اخلاقی فرائض کو تباہ اور ان کی انسانیت کو برباد کر د ۔ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کو یہ ان کی عادتیں خراب کرنا کہتے تھے اور ان کا مقولہ یہ بن گیا تھا کہ بزنس میں ایمانداری سے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ واقعہ تو یہ ہے کہ ترقی تو وہ کر گئے اور ایسی کہ شاید ہی کسی نے کی ہو مگر یہ بھی ایک عبرتناک واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی ان کا اعتبار کرتا ہو۔ ایک سرے سے سب ہی ان سے متنفر نظر آتے تھے۔ اب کے ایم اسلم صاحب سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اب تو

عرصہ سے ان صاحب نے خدا واسطے کا بیر باندھ رکھا ہے اور مشاقانِ ملاقات کو باز رکھنا اور رغلانا اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہیں۔

نکوی با بداں کردن چناں است کہ بد کردن بجائے نیک مردا

حساب کا رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بقول اسلم صاحب "بے ایماں بک ڈپو" ڈھائی ہزار روپے نکلتے ہیں اور اس رقم کو بٹہ کھاتے میں ڈال دیا ہے۔

یہ میں نے صرف ایک مثال پیش کی ہے، ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کی تکرار بے فائدہ ہے۔ البتہ ایک اور واقعہ کا بیان کرنا ضروری ہے جس سے اسلم صاحب کی وسیع القلبی کا پتا چلتا ہے۔

ایک معروف ترقی پسند ادیب کو اسلم صاحب سے بغض للہی ہے اور اپنے کئی مضامین میں دل کے پھپھولے پھوڑ چکے ہیں۔ اسلم صاحب یوں تو جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے چشم پوشی اور درگزر سے کام لیتے ہیں مگر ضبط اور صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اپنے مضامین میں اپنے مخالفین کی خبر لے لیتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ تہذیب و شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مگر ان صاحب کی جلی کٹی کا انتقام لینا بھی اسلم صاحب نے پسند نہ کیا۔ شومیِ قسمت سے یہ صاحب ایک مقدمہ میں ماخوذ ہو گئے۔ عدالت میں میں بھی موجود تھا، اسلم صاحب بھی تھے اور کئی اور کرم فرما بھی، ایک صاحب نے ضمانت میں اپنا نام بھر دیا مگر مجسٹریٹ ضامن کو نہیں جانتا تھا اس لیے تصدیق کرنے کے لیے ایک ایسے گواہ کی ضرورت ہوئی جسے مجسٹریٹ شخصی طور پر جانتا ہو۔ ضامن نے اسلم صاحب کی طرف ضمانت نامہ بڑھا دیا، انہوں نے بے چون و چرا اس پر دستخط کر دیئے۔ ضمانت منظور ہو گئی اور ترقی پسند ادیب کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ خالی شکریہ کے دو لفظ ہی کہہ دیتے۔ اسلم صاحب نے اس بدتمیزی کا بھی برا نہ مانا اور کہا تو یہ کہا کہ ان صاحب سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن میں عدالت کچہری میں ان کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ آخر ہیں تو اہلِ قلم ہی۔ ان کی پریشانی سے مجھے خوشی نہیں ہو سکتی۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است

دوستاں تلطف دشمناں

ادیب کی حیثیت سے میں اسلم صاحب کو پینتیس سال سے جانتا ہوں اور شخصی طور پر ۳۲ سال سے۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اسلم صاحب اب تک پندرہ بیس ہزار صفحات کی کتابیں لکھ چکے ہیں اور شاید ہی کوئی اردو پڑھنے وا ایسا ہو کہ ان کی کتابوں سے مستفیض یا لطف اندوز

اسلم صاحب نے مذہب، تاریخ، تنقید، افسانے اور مزاحیہ مضامین، سبھی کچھ لکھا ہے۔ اس لیے ہر مذاق کے پڑھنے والے کو ان کی کتابوں میں اپنی تسکین ذوق کا سامان مل جاتا ہے۔

اسلم صاحب کی ادبی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا۔ اور یوں بھی ان کتابوں کے ذریعے ہر شخص بقدر ہمت اردو ادب میں ان کا درجہ متعین کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک نظریہ یہ بھی ہے تصنیف مصنف کے کردار و رجحان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلم صاحب کی سیرت کا بھی ۰ ازہ کیا جا سکے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلم صاحب کے باب میں اس نظریہ کی صداقت بہت کچھ مشتبہ ثابت ہو گی۔ تاہم وہ پاکیزگی جو اُن کی ر زندگی میں کارفرما ہے ان کی ادبی تخلیقات میں بھی طاری و ساری ہے۔

اسلم صاحب لاہور کے ایک نہایت معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے خاندان میں بڑی قابل قدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ موجودہ افراد میں خان بہادر میاں امیر الدین اور میاں امین الدین۔ آئی۔ سی۔ ایس شامل ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے لاہور کو ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا، غالباً اس وجہ سے کہ نت نئے فیشنوں کی ایجاد یہیں سے ہوتی تھی، چنانچہ تہذیب فرنگ نے پنجاب کی قدیم تہذیب کو دیس نکالا دے د تھا۔ جب تہذیب نو نے رواج پایا تو نئی اخلاقی اقدار بھی رائج ہو گئیں۔ یہ سیلاب کسی کے روکے نہیں رکا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی آگاہی بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لاہور کے اونچے گھرانوں میں یورپی تہذیب نے دخل پا لیا۔ شعائر اسلامی کو ترقی میں حائل سمجھا گیا ا رانہیں پس پشت ڈال دیا گیا۔ متوسط طبقے کی معاشرت آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اپنی گوارانہیں پرائی کا یارانہیں۔ نچلے طبقے میں چولا بدلنے کی استطاعت کہاں؟ مگر متاثر ہوئے بغیر یہ بھی نہ رہ سکا۔ ممکن ہے کہ کچھ اور خاندان بھی ہوں مگر میں نے پرانی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور وقار صرف اسلم صاحب کے ہی خاندان میں دیکھا۔ ادب و آداب، قرینہ، سلیقہ، وضعداری، خلوص و محبت، غرض جو شرفائے قدیم کا دستور تھا اب بھی ان کے ہاں اس کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسے قدامت پرستی ہی کہہ لیجیے مگر یہ وہی جوہر ہے جس کے آخری پرستار علامہ مرحوم تھے۔ مغرب کی خوبیوں سے جس حد تک مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ اس خاندان کے افراد اس میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، چنانچہ مردوں میں آئی۔ سی۔ ایس اور خواتین میں بی۔ اے اور ایم۔ اے موجود ہیں۔ مگر اس اعلیٰ تعلیم نے نہ تو ان سے ان کا مذہب چھینا اور ۰ انہیں نقلی تہذیب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

اسلم صاحب جس زمانے میں گورنمنٹ کالج (لاہور) میں پڑھتے تھے تو انہیں شاعری کا شوق تھا۔ شعر دلکش کہتے تھے اور اکثر انعامات بھی شاعری کی بدولت ملے۔ ڈاکٹر اقبال اس زمانے میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور اسلم صاحب کے خاص کرم فرما۔ ان کے ادبی ذوق کو ڈاکٹر اقبال ہی نے ابھارا اسلم صاحب کو نثر لکھنے پر مرحوم ہی نے مائل کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ان کے تعلقات آخر تک بہت مخلصانہ رہے۔ اسلم صاحب کی معیت میں جب مجھے علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلا موقع ملا تو ان کی مہلک بیماری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ علامہ کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور بولتے تو ان کے تنفس پر زور پڑتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عید کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے گئے تھے۔ فرش ٹھنڈا تھا، دیر تک بیٹھا پڑا۔ سردی کا اثر ، گیا۔ آواز بالکل جاتی رہی۔ اس حالت میں بھی اپنے ملنے والوں سے گھنٹوں باتیں کرتے اور ان کی باتیں اتنی دلکش ہوتیں کہ وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھ سے اردو میں اور اسلم صاحب سے پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔ اسلم صاحب سے جو باتیں ہوئیں ان سے معلوم ہوا کہ ان کے باہمی تعلقات کس قدر د۔ اور مخلصانہ ہیں۔ علامہ کے انتقال کے بعد اسلم صاحب کے لیے لاہور کی ادبی زندگی ویران ہوگئی۔

اسلم صاحب کو بفضلہ دنیا کی سب نعمتیں میسر ہیں مگر اولاد کا سکھ ان کے نصیب میں نہیں ہے، ۔ ایک ایسا دکھ تھا جس نے ان کی زندگی کو کرکرا کر دیا۔ کوئی چالیس سال ہوئے انہوں نے اپنی بھانجی اصغری کو گود لیا ا راسے اس طرح پالا کہ اپنے پیٹ کی اولاد کو بھی کوئی کیا پالے گا مگر خدا کی شان کہ یہ بچی بھی چند سال ہی میں جنت کو سدھار گئی اور اسلم صاحب کی زندگی کی ٹریجڈی کو مکمل کر گئی۔ غم و مایوسی نے انہیں د۔ سے بیزار کر د۔ اصغری کی یاد نے انہیں د۔ انہ بنا دیا۔ کھانا چھوٹ گیا۔ نفیس لباس جاتا رہا۔ ہر وقت اصغری کی یاد میں نالہ گرم و آہ سرد، جب دل بہت بے قابو ہوا گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ شہر سے تین میل د قبرستان میں جا پہنچے اور لخت جگر کی قبر پر زاری صدقے ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا طبیب ہے، روح کا یہ زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گیا مگر اس کا داغ ساری عمر کے لیے رہ گیا۔ جب کسی بچے کو دیکھتے ہیں زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ اصغری کی جدائی نے ان کا دل گداز کر د۔ ا ران کی تحریر میں ایک کسک پیدا ہوگئی جو ان کے اسٹائل کی ایک نمایاں خصوصیت اور خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اصغری کو سدھارے بیس سال ہو گئے مگر آج بھی مرحومہ کا کمرہ جوں کا توں گھر میں موجود ہے، اس کمرے میں اصغری کی سب چیزیں بطور یادگار رکھی ہوئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچی کھیلتے کھیلتے ابھی کہیں باہر چلی گئی ہے۔

غم دنیا سے بچنے کے لیے انسان چند مشاغل اپنے لیے وضع کر لیتا ہے۔ جن میں انہماک سے

مصائب و آلام زندگی سے تھوڑی دیر کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ اسلم صاحب کے مشاغل میں سب سے یاں حیثیت ذوق خامہ فرسائی کو حاصل ہے۔ ادب کے جملہ شعبوں پر انہیں یکساں طور پر عبور حاصل ہے۔ شاعری سے انہیں مناسبت طبعی ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی شعر و شاعری سے ہوا مگر اسے کچھ زیادہ کارآ نہ پا کر نثر کی طرف رجوع ہوئے اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر بھی طبیعت مائل ہوئی۔ اس صنف میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج ان کا شمار ہمارے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اب تک کم و بیش ایک ہزار افسانے لکھ چکے ہیں۔ ان میں ہر قسم کے افسانے شامل ہیں۔ رومانی، تصوری، حقائق، حزینہ، طربیہ، عبرتناک، ہیبت ناک، اسلم صاحب کے انسانوں کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ ایک عالم پر محیط ہے۔ ہندوستان کے دیہ توں اور شہروں کے علاوہ یورپ، مصر، روس، ترکستان، عرب، چین اور جاپان کی سرزمین، باشندے رسم و رواج، رہن سہن وغیرہ بھی اسلم صاحب کے موضوع افسانہ ہیں۔ آپ کو ان افسانوں میں کسی سوسائٹی کی تصویریں ہی نہیں ملیں گی بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقے کا سچا عکس ان افسانوں میں آپ کو دھوپ چھاؤں کی طرح دکھائی دے گا۔ کہیں امیر کا محل کھڑا قہقہے لگا رہا ہے اور کہیں غریب کی جھونپڑی آنسو بہا رہی ہے۔ کہیں زندگی کی کشمکش ہے کہیں رومانی سکون، کہیں گناہ و موت کی لرزہ خیز داستان ہے کہیں حسن و عشق کی دلکش کہانی ہے کہیں رندی و ہوسنا کی کے سنسنی پیدا کرنے والے قصے، کہیں جرم سزا، انسانی درندگی و شقطیت کی لرزہ خیز داستان۔ کہیں ہنس مکھ مزاجی ہیں جن کی ہر بات لطیفہ ہوتی ہے کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں یا پھر ایک چٹکی کہ سہلاتے اور تلملاتے ہی پھر یئے، ان سب افراد قصہ کی نفسیاتی تحلیل ایک ماہر افسانہ نگار کی طرح لوہے کے چنے چبانا ہے مگر اسلم صاحب نے کچھ اس سادگی سے یہ ہفت خواں طے کیا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر ذرا بار نہیں پڑتا۔ مصنف کا طرز بیان دل کا کنول کھلاتا جاتا ہے اور ٗ افسانے میں طاری و ساری ہو کر پڑھنے والے کے شعور میں غیر محسوس طور پر پھر گھل مل جاتا ہے۔

طبع زاد مضامین کے علاوہ اسلم صاحب نے انگریزی کی بعض مشہور کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ مہدی، طلسم سامری اور نرگس نے کافی شہرت پائی، بالخصوص موخر الذکر نے ترجمہ کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اصل کی ساری خوبیاں ترجمہ میں قائم رہیں اور عبارت گنجلک نہ ، ۔ اسلم صاحب آسان زبان لکھتے ہیں و زبان جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عبارت آرائی اور ثقیل الفاظ سے مرعوب کرنے کے عادی نہیں ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ شستہ ور ٘ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو کتاب میں طبع زاد تصنیف کا

لطف آتا ہے، ان کا ایک معرکتہ الآرا ترجمہ ''ہیر رانجھا'' ہے۔ جو وارث شاہ کے شاہکار کا ترجمہ ہے۔ جن لوگوں کو پنجابی نہیں آتی انہیں اب تک صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ ایک عشقیہ داستان ہے۔ دوسری پنجابی عشقیہ داستانوں کی طرح۔ مگر اب جب کہ اس کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ادب کا ایک خزانہ ہے جو اب تک پنجابی میں پوشیدہ رہا۔ رومان سے قطع نظر اس کی ایک بیش بہا ادبی حیثیت بھی ہے۔ اچھوتے ۔لات نادر تشبیہات لطیف کنائے، فلسفیانہ بحثیں، دلکش مکالمے، خیال انگیز بیان، غرض ادب کا ایک شہ ۔رہ ہے جس سے اب تک ہم محروم رہے۔ اردو کو مالا مال کرنے میں تراجم کا بڑا حصہ ہے۔ اور ہیر رانجھا ایک ایسا اضافہ ہے۔ کہ اسلم صاحب کی یہ سعی ہمیشہ مشکور رہے گی۔

اسلم صاحب کے طبع زاد مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض سال کے بہترین افسانے قرار دیئے گئے اور گرانقدر انعامات سے ان کی قدر دانی کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں ان کی بیشتر کتابیں منظور ہو چکی ہیں۔ پبلشرز میں ہر طرف سے ان کے مسودات کی مانگ رہتی ہے۔ پہلے یہ کسی سے انکار نہیں کرتے تھے اور سائل کی دل شکنی گناہ سمجھتے تھے مگر جب انہیں تجربہ ہو گیا کہ کیسے کیسے مار آستین پبلشر ہیں تو ان کا خلوص و اعتماد مجروح ہو گیا ا راب محتاط رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے بھی اسلم صاحب ۔وہ دوست بنانے کے قائل نہیں ہیں اور تلخ تجربات کی بنا پر انہوں نے ایک طرح سے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں اکثر حضرات نیاز مندانہ داخل ہوئے۔ منافقانہ شامل رہے اور ان کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر معاندانہ رخصت ہوئے اور اب مخالفانہ طرز عمل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اردو میں ناول کی ا۔　　　۔یر احمد سے ہوئی اور ان کے اخلاقی و معاشرتی ناول آج تک اسی ۔ وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ شرر نے اسلامی تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا ا راردو ناول کو کافی فروغ ۔۔ ان کے بعد ناول نگاری میں ابتذال آنا شروع ہوا اور اس حد تک کہ ناول ایک بدنام لفظ ہو گیا کہ بھلے آدمی اس کے نام سے ہی کانوں پر ہاتھ رکھنے لگے۔ علامہ را　الخیری اور پریم چند نے اس صنف ادب کو پستی سے نکال کر پھر عروج دیا مگر ان دونوں کے انتقال کے سا　ناول کی بساط بھی الٹ گئی۔ اسی زمانے میں مختصر افسانہ ترقی کے پر لگا کر اڑا ا رسب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ اسی زمانے میں ناول کو حیات نو دینے کی کئی کوششیں ہوئیں مگر ترجمہ کی حد سے آگے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر ہر افسانہ نگار کو ناول نویسی کا شوق ہو گیا اور متعدد ناول شائع ہوئے۔ منشی پریم چند نے جہاں ناول کو چھوڑا تھا اس سے آگے اسے کوئی نہ بڑھا سکا۔ اسلم صاحب نے بھی اس کی کو محسوس کیا اور ایک ضخیم ناول شمسہ لکھ کر بطور نمونہ پبلک کے سامنے

پیش کیا۔ پانچ مہینے میں ایک ہزار جلدوں کا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد شام وسحر شائع ہوا۔ اس کی ایک ہزار جلدیں تین ماہ میں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد رقص بہار شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پھر تو اسلم صاحب کے ناولوں کا تانتا بندھ گیا اور ہر سال کئی کئی ناول چھپنے لگے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے کسی مصنف کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کہ اس کی کسی تصنیف کا ایک ایڈیشن تین مہینے ہی میں ختم ہو جائے۔

بظاہر یہ ایک اچنبھا نظر آتا ہے کہ پانچ ہزار صفحے اسلم صاحب نے صرف دو سال میں لکھے اور ان کی قدردانی سے ثابت ہے کہ ان میں بھرتی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے ان کے ذاتی ذوق و شوق کا۔ اردو سے والہانہ عشق کا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی پانسو صفحہ کی ایک مشہور کتاب صرف پچیس دن میں لکھی گئی ہے۔ آمد کا یہ حال تھا کہ قلم خیالات کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ گھنٹوں لکھتے تھے، دن کو، رات کو، جب بھی فرصت ملے، یہاں تک کہ بازو شل ہو جاتا اور انگلیاں سیدھی نہ ہوتیں، برخلاف اس کے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہینوں کچھ نہیں لکھتے، کچھ لکھا ہی نہیں جاتا، ایسے بنجر زمانے ہر مصنف کی زندگی میں آتے ہیں۔

اسلم صاحب کی روز افزوں شہرت و مقبولیت نے بعض تنگ دلوں کو چہ میگوئیاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعض ادیبوں نے جب یہ آندھی چڑھتی اور اپنے چراغ جھلملاتے دیکھے تو مخالف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور بعض نقادوں نے بھی اس سے متاثر ہو کر غلط سلط رائے زنی کی۔ ایک صاحب نے لکھا کہ اس صاحب کی زودنویسی نے انہیں نقصان پہنچایا۔ حالاں کہ تنقید کے کسی اصول کے مطابق زودنویسی عیب نہیں سمجھی گئی۔ ایک اور کرم فرما نے فتویٰ دیا کہ اسلم صاحب ضرورت سے لکھتے ہیں۔ ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اسلم صاحب روپے پیسے کی ضرورت سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں، چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ مالی مشکلات اسلم صاحب کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو خود اپنی نظر میں اپنی رائے کی کیا وقعت رہ گئی ہو گی؟ اس قسم کے بعض بے جا اعتراضات سے اسلم صاحب اکثر بددل ہو جاتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ ساری عمر اردو کی خدمت کرنے کا یہ صلہ ملا ہے۔ اسلم صاحب کو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ نے انہیں محسود . یا ہے اور ان کی محنت و خدمت کا صلہ اصل میں ان کی تصانیف کی مقبولیت و شہرت ہے۔

اسلم صاحب کا دوسرا مشغلہ شکار ہے۔ سنا ہے کہ نشانہ اچھا لگاتے ہیں اور ان کے ہاں کھالوں کی کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار ان کے پا　خود کھنچ کر چلا آتا ہے۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
امید آنکہ زے بہ شکار خواہی آمد

شکار کے سلسلے میں دیہاتی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا اسلم صاحب کو اچھا موقع ملا۔ اس مشاہدہ ا رمطالعہ نے ان کے انسانوں کو زندگی کی وہ تازگی و توانائی بخشی ہے جو سنی سنائی با یا کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی، ان کے افسانوں میں جو دلکش منظر کشی ہوتی ہے وہ بھی اسی سیر و شکار کا نتیجہ ہے۔ یوں شکار جو بقول شہنشاہ اورنگ زیب بے کاروں کا کام ہے۔ ان کے لیے ایک کارآمد مشغلہ ثابت ہوا اور دیہاتی زندگی کو ادب سے روشناس کرانے میں اسلم صاحب کا حصہ منشی پریم چند سے کم نہیں۔

اسلم صاحب کا تیسرا مشغلہ موسیقی ہے۔ گراموفون کے سیکڑوں ریکارڈ ان کی دلبستگی کا ساما ہیں اور جب سے لاسلکی نشریات ہندوستان میں شروع ہوئیں تو ان کے ڈرائنگ روم میں ایک آل ویورٹ ۔ سیٹ کا اضافہ ہو گیا۔ ان کی حساس طبیعت یو تو پکے گانے سے بھی بیزار نہیں ہوتی مگر ہلکے پھلکے گیتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے اکثر افسانوں کی تحریک بعض بہت معمولی گیتوں سے ہوئی ہے۔ مثلاً پنجاب کا کوئی ڈھولک گیت انہوں نے سنا اور دل کو لگ گیا تو اسے پھر سنا۔ کچھ بھولے بسرے مناظر اور ا سے وابستہ تاثرات اجاگر ہونے لگے۔ ریکارڈ پھر بجایا ا ر پھر بجایا اور بجاتے رہے یہاں تک کہ ایک پورا منصوبہ افسانے کا گٹھ گیا ا ر جتنی دفعہ بھی ریکارڈ بجایا کہانی کی تفصیلات پرے باند باندھ کر سامنے آتی رہیں اور بالآخر خیال کے شیشے میں افسانے کی پری اتر آئی۔ اسلم صاحب کے ریکارڈوں ئزہ لیتے وقت معلوم ہوا کہ ایک ہی گانے کے تین تین ریکارڈ موجود ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ریکارڈ گھس کر بالکل بیکار ہو چکے ہیں۔ اس لیے تیسرا ریکارڈ لانا پڑا اور فلاں عنوان کا جو افسانہ لکھا گیا تھا اس کی تحریک اسی گیت سے ہوئی تھی۔ لہٰذا افسانے کی فضا پوری طرح طاری کرنے کے لیے یہ ریکارڈ بے شمار مرتبہ سنا گیا۔ خلوت میں، جلوت میں، اول شب، آخر شب، دن کے ہنگامے میں، رات کے سناٹے میں اور جب تصور مکمل ہو گیا تو تصور پیش کرنے میں بھلا چابکدست مصور کو کیا دشواری ہو سکتی تھی؟ دو گھنٹے نہیں چار گھنٹے۔ مگر اسلم صاحب کے افسانوں کے شائقین کو کیا معلوم کہ افسانہ لکھنے کے لیے انہوں نے کتنی راتیں کالی کی ہیں۔ اور چول سے چول بٹھانے میں انہیں کتنی دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے کہانی کا پلاٹ مرتب کرنے میں کس ذہنی کرب و اذیت سے انہیں دنوں جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ آج اردو کے مصنفین میں ایم۔ اسلم سے ز۔ ہر دلعزیز اہل قلم اور کوئی نہیں ہے۔ ا ر یہ شہرت اور مقبولیت انہیں یونہی کسی نے ہاتھ اٹھا کر نہیں دے دی بلکہ

محنت مشقت دماغ سوزی، دماغ کا ست اور آنکھوں کا تیل نکالنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ ان کے قلم کی شگفتگی قائم و دائم رہے تا کہ ادب کی معطر کلیاں سدا کھلتی رہیں۔

لگے ہاتھوں اسلم صاحب کے دو ناولوں ''چشم لیلیٰ'' ا ر''فریاد خاموش'' کے بارے میں بھی چند باتیں سن لیجیے۔

سر ڈاکٹر اسکاٹ جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتے تھے اس کی کھڑکی کچھ اس طرح پر واقع تھی اور میز کچھ اس انداز سے رکھی تھی کہ لکھتے وقت سامنے کے فلیٹ سے صرف ان کا ہاتھ ہی نظر آتا تھا۔ وہ دن بھر لکھتے، رات بھر لکھتے، سامنے کے فلیٹ میں ایک لڑکی رہتی تھی، وہ جب کبھی چھجے پر آتی تو وہ دیکھتی کہ ایک ہاتھ مسلسل چل رہا ہے۔ تو کچھ دن تک وہ اسے غور سے دیکھتی رہی لیکن سمجھنے سے قاصر رہی کہ یہ کیا چیز ہے جو ہر وقت قلم لیے چلتی رہتی ہے؟ البتہ کچھ دن بعد اسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی بھوت ہے اور اس پر یہاں تک اثر ہوا کہ اس نے چھجے پر آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا کہ ''اماں! یہ کیا چیز ہے جو قلم ہاتھ میں لیے ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے اور نہ کوئی اور۔ اس کمرہ میں بھوت رہتا ہے۔ جب ہی تو صرف یہ ہاتھ لکھتا رہتا ہے۔ ماں نے بھی اس چلتے ہوئے ہاتھ کو غور سے دیکھا اور بڑی سٹپٹائی۔ پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ سامنے کے فلیٹ میں والٹر اسکاٹ رہتے ہیں اور وہ اپنے ناول لکھا کرتے ہیں۔

تو صاحب با - یہ ہے کہ ایم۔ اسلم بھی لکھنے کے لحاظ سے اردو کے والٹر اسکاٹ ہیں۔ وہ جس تیزی کے ساتھ ضخیم ضخیم ناول لکھتے ہیں یہ کچھ انہی کا دل گردہ ہے۔ صبح سے شام تک لکھتے رہتے ہیں۔ را - گئے تک ان کا قلم کاغذ پر چلتا رہے گا اور جب ہاتھ تھک کر شل ہو جائے گا اس وقت کہیں جا کر لکھنا بند کریں گے۔ ان کے لکھنے کی رفتار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ضخیم سے ضخیم ناول مہینہ بھر میں لکھ لیتے ہیں۔ آٹھ سو صفحے کی چشم لیلیٰ انہوں نے ڈیڑھ ماہ میں لکھ دی اور '' یاد خاموش'' پندرہ بیس دن میں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی فارغ البالی کو بڑا دخل ہو کہ اس کے علاو انہیں کوئی اور کام نہیں ہے۔ لیکن اور کچھ نہیں، اس تیزی سے اور روانی سے اس کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے دماغ میں پلاٹ کہانی، مکالمہ اور منظر کا بڑا خزانہ پوشیدہ ہے اور ناول اور افسانے لکھنے کی ان میں کسی قدر صلاحیتیں پنہاں ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم ہی اردو کے واحد ناول نگار ہیں، جو اس قدر تصانیف کے مصنف ہیں۔ کم وبیش وہ اب تک پچاس ہزار صفحات سے اردو کی خدمت کر چکے ہیں۔ اس لیے مجھے تو کم از کم یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے

ہاں کے نقاد ایم۔ اسلم کی خدمات کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں اور جتنی انہیں صلہ کی صورت میں تحسین ملنی چاہیے تھی وہ نہیں ملی۔

یہی نہیں کہ وہ صرف لکھتے ہی ہیں بلکہ ان کے ناول بڑے شوق سے عوام میں پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں گرما گرم روٹیوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام ان سے اور ان کی تحریروں سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہر ناول کا پہلا ایڈیشن تقریباً چار ماہ کے اندر ختم ہو جاتا ہے اور اکثر ناولوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے کئی کئی ایڈیشن سال بھر کے اندر ہی چھپ جاتے ہیں، اس کی تازہ مثال، رقص ابلیس ہے سال بھر کے اندر ہی اندر اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکے ہیں حافظ نے سچ کہا ہے۔ ع

قبول خاطر لطف سخن خدا است

عوام کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ وہ چیزیں جو عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہیں، جو ان کے محسوسات و . بات سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایم۔ اسلم کے ناول ''عوامی ادب'' کے ذیل میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ روس میں ان ناولوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے جو عوام میں مقبول ہوتے ہیں اور ان میں سے کئی ناول نگاروں کو ''اسٹالن پرائز'' بھی مل چکا ہے۔ ایم۔ اسلم کے ناولوں نے ''عوامی ادب'' میں بیش بہا ا فہ کیا ہے۔ اسلم صاحب عوامی ادیب ہی نہیں ہیں، وہ مسلمان بھی ہیں۔ وہ اپنے دل میں اسلامی جذبات اور اسلام کا صحیح درد بھی رکھتے ہیں اس لیے ان کے ناولوں میں پاکستانی ادب کے اساسی تصورات بھی ر ا دواں نظر آتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ناول پاکستانی ادب کے ذیل میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس وقت اردو میں کوئی ایسا عوامی ناول نگار نہیں جو ایم۔ اسلم کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکے۔ ایم۔ اسلم اردو کے عوامی ادب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

ان کے دو تازہ ناولوں میں ''چشم لیلیٰ'' ایک حسین وادی کے ایک کوہستانی علاقے کی ایک رومانی داستان ہے۔ ایک ایسی مظلوم لڑکی کی داستان جو محبت کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہتی ہے لیکن اسے مرد دھوکے میں رکھتا ہے اور اس کی معصوم زندگی سے فائدہ ا تا رہتا ہے۔ اس ناول میں یہ لڑکی اپنی زندگی کی داستان سناتی ہے اور اس کی زندگی کی دل موہ لینے والی داستان پر ہی ناول کا بڑا حصہ مشتمل ہے۔

جب مرزا اس سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔ تو و دیتی ہے۔

''ایک رنگ رنگیلی دنیا کی۔ اس دنیا کی جہاں جوانی کے جذبا - . ار ہو کر زندگی کے لطف سے

آشنا ہوتے ہیں۔ اس دنیا کی جہاں آرزوئیں مچلتی ہیں۔ جہاں شوق نشوونما پاتے ہیں۔ اس دنیا کی جو قہقہوں کی دنیا ہے، وہ دنیا جہاں شباب اور جوانی اپنی قدر و قیمت سے بیگانہ نہیں ہوتے۔''

لیلیٰ نے اپنی زندگی جیسی گراں بہا چیز بھی اس فریب ہی کی نظر کر دی۔ ناتجربہ کار لڑکی سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟ اور آخر میں شہباز اس سے محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے لیکن جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ بھی کترا کر نکل جاتا ہے یہ غمگین لڑکی جس کی ماں ٹھیکیدار کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ یہ ستم رسیدہ لڑکی جس کا باپ اپنی بیوی کے غم میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ یہ فلاکت زدہ لڑکی ایک عیسائی، یتیم خانہ میں پرورش پاتی ہے اور یہاں سے ایک مکار مرد اسے بہکا کر لے جاتا ہے اور اسے ان امریکی سپاہیوں کے سپرد کر دیتا ہے جنہیں تفریح کے لیے ایک لڑکی درکار ہوتی ہے۔ لیلیٰ روتی ہے مگر بے د۔ مکار مرد اسے مجبور کرتا ہے۔ ایک گناہ سے بچنے کے لیے اس سے مجبوراً بار بار گناہ سرزد ہوتے ہیں اور آخر کار یہ ایک کوہستانی علاقے میں مریم اور قزاق کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ مرزا پنجاب کا ایک شکاری وہاں پہنچتا ہے۔ جلد ہی دونوں میں انس بڑھ جاتا ہے اور لیلیٰ تعلیم یافتہ مہذب اور سمجھدار لڑکی اسے اپنی زندگی کی غمگین داستان سناتی ہے۔ مرزا لیلیٰ سے حقیقی محبت اور ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے اور شہباز کو جس سے وہ محبت کرتی ہے لیکن جواب لیلیٰ کے پرانے واقعات معلوم ہو جانے کی وجہ سے نفرت کرنے لگتا ہے، اس سے ملا دیتا ہے ۔

شکر کہ میان من صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ

اس طرح ''چشم لیلیٰ'' رومانی اور نشاطیہ داستان بن جاتی ہے۔

آٹھ سو صفحے کے اتنے ضخیم ناول میں فنکارانہ تناسب و توازن رکھنا کچھ ایم۔ اسلم ہی کا حصہ ہے۔ کرداروں میں لیلیٰ، مرزا، قزاق اور مریم کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کردار دل پر ایک خاص اثر چھوڑتا ہے اور ہم ہر کردار کی کسی نہ کسی خوبی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً لیلیٰ کی معصومیت، ذہانت اور بے باکی۔ مرزا کی حقیقی محبت پاکبازی اور خلوص۔ مریم کی بے لوث خدمت، قزاق کا وحشی پن اور معمر ہونے کے باوجود لیلیٰ سے شادی کرنے کی خواہش۔ اس کی حرکات و سکنات اور بعد میں لیلیٰ کو بیٹی بنالینا ایک خاص اثر مرتب کرتا ہے۔

ایک بات اس ناول میں اور قابل ذکر ہے اور وہ ہے موقع و محل کے مطابق رسیلے گیتوں کا

استعمال اور اشعار کی برجستگی تو گویا سونے پر سہاگہ ہے۔

ایم اسلم کی یہ خصوصیت تو اظہر من الشمس ہے کہ وہ فطری مناظر کو ایسی خوبی سے صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں کہ قارئین اپنے ذہن میں وہ سب کچھ دیکھنے لگتے ہیں جو مصنف دکھانا چاہتا ہے۔ سبزے کی تراوت اور چشموں کی ٹھنڈک تک محسوس ہونے لگتی ہے اور اس طرح یہ منظر محاکات کے لازوال نمونے بن جاتے ہیں۔ مشتے نمونہ از ارے۔

مشاطہ قدرت نے سبزے کا ایک بہت خوبصورت فرش بچھا رکھا ہے، اس زمرد فرش پر خوشنما اور رنگا رنگ کے پھول بڑی کثرت سے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے پرستان کی پریوں کے لیے ہمالیہ کے دیوؤں نے ایک عظیم الشان اور بے بدل قالین بچھا رکھا ہے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی ندیاں پہاڑ کے بطن سے پیدا ہو کر پتھروں اور وادیوں کی آغوش میں اچھلتی کودتی، مستی اور شباب کے گیت گاتی کسی تیز رو مسافر کی طرح کسی دور کی منزل کو چلی جاتی ہیں اور کبھی ان گل ر ادیوں میں دختر خوش خرام ابر پہاڑ سے اتر کر وادیوں کے مکینوں کو حیات نو کی نوید دیتی پھرتی ہے۔''

ایم اسلم بڑی پاکیزہ زبان لکھتے ہیں اور مکالمے تو بہت ہی چست اور رواں ہوتے ہیں۔ ناول پڑھتے وقت یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور کہیں ہوا ہے اور اس کا احساس مصنف کو بھی ہے، اسی لیے تو و بار بار کہا کرتا ہے۔

''ا ر جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کس طرح بعض دوستوں نے یہ حیرت انگیز واقعات میری ہی زندگی کے رومان سمجھ لیے تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ خصوصیت سے جمال رام کی کہانی۔ حیات تازہ، فیروزہ، جام شکستہ، ا نہ، نرگس اور شب غم کے متعلق پڑھنے والوں میں سے تو اکثر یہ قسم کھانے کو بھی تیار تھے کہ ان تمام رومانوں کا ہیرو میں ہی ہوں۔''

''چشم لیلیٰ'' جہاں ایک دلکش رومانی ناول ہے۔ اس کے برعکس ''فریاد موش'' ایک المیہ رومان ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کی ز. دست ٹریجڈی۔ یہ لڑکی شیام سے محبت کرتی ہے۔ لیکن ناتجربہ کاری کی بنا پر شیام اور لڑکی (سیتا) دونوں ایک دوسرے سے شادی کے وعدہ وعید کے باوجود دور ہو جاتے ہیں۔ جب و ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور اس الگ ہونے میں غلط فہمی کو ہی دخل ہے تو سیتا اس وقت حاملہ ہوتی ہے۔ شیام بھی سیتا ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور سیتا بھی شام ہی سے شادی کرنے کی خواہش مند ہے مگر حالات اور زمانہ کے واقعات انہیں دور سے دور تر کر دیتے ہیں، و ا عزت کو بچانا چاہتی ہے

ا راپنے ایک محسن سوامی کے پاس جاتی ہے اوران کے ذہن میں سوائے اس کے کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے شادی کریں اور باہر والوں پر یہ ظاہر کریں کہ یہ بچہ ان کا ہے۔ سوامی کی یہ زبردست قربانی تھی لیکن سوامی درپردہ اس کو اپنی بیٹی بنالیتا ہے۔ ا ر یہ لڑکی شام کے غم میں بچہ ہونے سے پہلے ہی گھل گھل کر مر جاتی ہے۔ موت اور پھر سیتا کی موت اس سے زیـد اور کیا المناک کہانی ہوسکتی ہے۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ ز میں لکھی گئی ہے اور قارئین کے ذہن پر بڑے الیہ تاثرات چھوڑتی ہے۔

ایک بات جو ہمیں ایم اسلم کے ہاں خاص طور سے منفرد ملتی ہے وہ ہے پلاٹ کا ٹیڑھا میڑھا چلنا۔ اگر آپ کوئی ناول شروع کریں تو آپ کو شروع شروع میں اندازہ ہوگا کہ آگے کہانی کچھ اس انداز میں چلے گی لیکن جیسے جیسے آپ ناول پڑھتے جائیں گے آپ کی حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ واقعات وحالات آپ کی توقع کے خلاف نکلیں گے اور شاید ایم اسلم کے ناولوں میں دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے۔ ''حیرت'' بڑے ادب کا جزولاینفک ہوتی ہے اور اگر حیرت کے احساسات مصنف واضح طور سے ظاہر کر سکے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب میں اس خصوصیت کے حامل متعدد ناول ہیں لیکن اردو میں یہ خصوصیت خال خال ہے، اس کی طرف ایم اسلم اپنے ناول کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ

''میں جب کوئی ناول لکھنا شروع کرتا ہو ۔ یہ کبھی نہیں سوچا کرتا کہ اس کا اختتام یا انجام کیا ہو گا۔ ناول کا اختتام یا انجام واقعات پر منحصر ہوتا ہے۔''

ایم۔ اسلم کے اس نہ سوچنے سے ان کے ناولوں میں بڑی جان سی آجاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایم اسلم جب بھی اپنے ناولوں کے انجام پر غور وفکر کرنے لگیں گے اور جب وہ اپنے ناولوں کو بڑی فکر کے بعد لکھیں گے تو مقبول عام ناول نگار ۔ رہیں گے۔

اس کے علاو ایک اور خصوصیت جو اردو کے کسی ناول نگار میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایم۔ اسلم کو کوئی ایسا منظر دکھانا ہے جس میں ان کا ہیرو اپنی محبوبہ کے انتظار میں ایک گھنٹہ سے کھڑا ہے لیکن محبوبہ نہیں آتی، تو ایک گھنٹہ تک قاری کو بھی انتظار کی گھڑیاں گننی پڑیں گی۔ ناول کا پلاٹ وہیں کا وہیں رہے گا اور افسردگی اور تھکن کا جو احساس ہیرو کے ذہن پر ہوتا ہے وہی قاری کے ذہن پر ہوگا۔ یہ وہ فنی کامیابی ہے جس کے لیے لکھنؤ اور دہلی کے داستان گو مشہور تھے۔ دہلی میں ایسے داستان گو بھی گزرے ہیں جنہوں نے مسلسل چار برس تک ر ز داستان سنائی اور داستان وہیں کی وہیں رہی جہاں چار سال قبل تھی اور یار کے د۔ ر کے

لیے جو پردہ اٹھنے والا تھا وہ اسی طرح پڑا رہا۔ یہ فن کا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اپنی کتاب ''آرٹ کیا ہے؟'' میں عظیم فن کی یہی تعریف کی کہ جو اثر مصنف کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے اگر وہ اس اثر کو کاغذ پر منتقل کر دے اور پڑھنے والے پر بھی وہی اثر طاری ہو تو یہ فن کا کمال ہے۔ ایم۔ اسلم اس تاثر نگاری میں اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

ایم۔ اسلم بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں مجھے ان میں اردو کے ناول کا مستقبل نظر آتا ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ وہ اب ان رومانوں کو چھوڑ کر تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے اردو میں تاریخی ناولوں کی بے حد کمی ہے۔ اچھے اور برے رومان تو مل ہی جاتے ہیں اور پھر ایم۔ اسلم کے متعدد رومان خود موجود ہیں لیکن تاریخی ناول عبدالحلیم شرر کے بعد سے اب تک نظر نہیں آتے۔ تاریخی ناول سے اسلم صاحب اسلامی یہ بھی پیدا کر سکیں گے۔ ملک و قوم کی خدمت بھی انجام دے سکیں گے اور مسلمان قوم کو اس کا ماضی دکھا کر اس کے مستقبل کو ایک ز. دست جذبہ کے سا۔ درخشاں بھی بنا سکیں گے، اس وقت قوم و ملک کو ایم اسلم کے قلم کی ایم اسلم کی صلاحیتوں کی اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے۔ اس طرح و ایسی خدما - انجام دیں گے کہ پاکستان کی ادبی اور معاشرتی تاریخ میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

اسلامی تاریخ کی مختصر کہانیاں ایم۔ اسلم صاحب پہلے لکھ بھی چکے ہیں۔ خود ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے سچا درد ہے۔ ناول نگاری تو ان کا محبوب مشغلہ ہے ہی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر و اسلامی ناول یا تاریخی ناول لکھیں گے تو نہ صرف کامیابی سے لکھیں گے بلکہ ان کی ہر دلعزیزی میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ یوں وہ عندالناس مشکور اور عنداللہ ماجور بھی ہوں گے۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ بیس بائیس سال پہلے لکھا گیا تھا اور کچھ حصہ دس بارہ سال پہلے مضمون کی نظر ثانی میں نے کر دی ہے مگر اس میں کسی قسم کا رد و بدل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گزشتہ دس سال میں اسلم صاحب نے متعدد اسلامی تاریخ کے ناول بھی لکھ دیئے ہیں ا ر ناولوں کا ایک ایسا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مکمل طور پر آ جائے گی۔ یہ ان کا ایک بہت بڑا رنامہ ہوگا۔ ان شاءا۔)